اُردو افسانے پر عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات

ڈاکٹر روبینہ ترین* صباحت مشتاق**

Abstract

In this research article it has been traced that western literary and philosophical movements has influenced Urdu short story.
The movements like realism, surrealism, Dadaism and others became the part of our literary tradition. So these movements, trends, and behaviours made their influence on Urdu short story.

بیسویں صدی میں میں مغرب کے علاوہ جب ہم بیسویں صدی کے ہندوستان کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی ہمیں ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرتا نظر آتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کی تمدنی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ ذرائع مواصلات کی ترقی نے فاصلوں کو کم کر دیا۔ سائنسی ایجادات نے تہذیبی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ تعلیم کے عام ہونے سے انسانوں میں سائنسی اور تاریخی شعور پیدا ہوا جس نے رنگ ونسل کے فرسودہ نظریات کو رد کر دیا اور شرفِ آدمیت اور مساواتِ انسانی کے تصورات عالمگیر پیمانے پر اُبھرے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقائے انسانی، فرائیڈ کا نظریۂ نفسی لاشعور اور تجزیہ نفس کے ساتھ کارل مارکس کے طبقاتی شعور کے نظریات برصغیر کے اس تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچ رہے تھے جو اگر چہ مغربی تعلیم کا پیدا کردہ تھا مگر یہ لوگ مغرب پر رشک کے ساتھ ساتھ نفرت بھی کرتے تھے کیونکہ اُنہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ مغربی حکمرانوں نے ہندوستان کے کروڑوں باشندوں پر غلامی اور افلاس مسلط کر رکھا ہے۔ وہ اُن کا استحصال کرنے کے بعد اُن سے ممنونیت کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ برطانوی حکومت کی جابرانہ حکمتِ عملی کے تضاد نے ہندوستان کی سیاسی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں ملازمتوں کے حصول کی دوڑ نے تصادم کی شکل اختیار کر لی جس نے مسلمانوں میں غلامی کے احساس کو اور گہرا کر دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاصلہ اور بڑھ گیا۔ برصغیر کے سیاسی حالات پہلے ہی ابتری کا شکار تھے کہ ۱۹۱۴ء میں ہونے والی پہلی جنگ عظیم کے اثرات نے برصغیر کی معیشت کو تباہ کر دیا۔ اقتصادی بدحالی نے عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکا دیا اور وہ

---

* صدر شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

** شریک مقالہ نگار ایک این جی او، ایشاء فاؤنڈیشن سے وابستہ ہیں۔

سڑکوں پر نکل آئے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشترا کی انقلاب انقلاب آیا جس کی سیاسی حیثیت نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ ہندوستان بھی اُس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اِس کے بعد امرتسر جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء کے واقع نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بغاوت کی آگ نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا★ ۱۔ ایسے میں تحریک خلافت ۱۹۱۹ء جلیانوالہ باغ کا سانحہ اور دیگر واقعات نے وقتی طور پر ہندو مسلم تنازعات کو ختم کر دیا اور دونوں نے مل کر حکومت سے عدم تعاون ۱۹۲۰ء شروع کر دیا۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں ہندوؤں، مسلمانوں کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس کے بعد تحریک خلافت کی قیادت گاندھی کے ہاتھ لگی جنہوں نے مسلمانوں کے جوش وخروش سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اُنہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ سرکاری اعزازات واپس کر دیں اور سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کر دیں، مگر اس فیصلے سے صرف مسلمان ہی متاثر ہوئے کیونکہ علی گڑھ کے سینکڑوں طالب علموں نے تعلیم ترک کر دی۔ اعزازات حکومت کو واپس کر دیئے گئے۔ ٹیکس نہ دینے کی تحریک چلائی گئی اور عوام تشدد کے راستے پر چل پڑے۔ جبکہ بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ پر گاندھی کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔

۵ فروری ۱۹۲۲ء کو گورکھپور میں لوگوں نے ایک تھانے پر حملہ کر کے ۲۱ سپاہیوں اور ایک پولیس انسپکٹر کو زندہ جلا دیا چنانچہ گاندھی نے فوراً اس تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے دوبارہ فرقہ ورانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برطانوی حکومت حالات کی نزاکت کو سمجھ چکی تھی لہٰذا مقامی لوگوں کا دِل بہلانے کے لئے حکومت نے آئینی اصلاحات کے نام پر ایک نیا جال بنا اور ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ اس کمیشن میں کوئی بھی مقامی باشندہ یا لیڈر شامل نہ تھا۔ کانگرس نے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ کے اُس دھڑے نے جس کی قیادت قائداعظم کر رہے تھے نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ ۱۹۳۰ء میں کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی جس میں ہندوستان کے لئے وحدانی طرزِ حکومت کی بجائے وفاقی طرزِ حکومت کی سفارش کی گئی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ تجویز کیا گیا۔ اس رپورٹ پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے سول نافرمانی ۱۹۳۰ء کی تحریک شروع کر دی گئی اور ہندوستان ایک بار پھر سیاسی بدامنی کا شکار ہو گیا۔ جاگیرداری نظام بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ دستی صنعتیں بالکل برباد ہو گئی تھیں۔ دربار کے خاتمے کے ساتھ ہی علوم وفنون کی سرپرستی بھی ختم ہو گئی۔ انگریز حکومت نے صنعت کو ترقی دینے کی بجائے اُسے خام مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ ان تمام حالات و واقعات کے نتیجے میں عوام میں بددلی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فکری سطح پر دو مختلف دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک مغربی تحریکوں اور اُن کے اثرات کا دوسرا برصغیر میں اُٹھنے والی ادبی تحریکوں کا۔ مغرب میں صنعتی اور سائنسی ترقی اگرچہ بہت سی فرسودہ روایات کے خاتمے

کا سبب بنی لیکن ان تبدیلیوں کے تضادات بھی سامنے آنے لگے۔ مغرب میں علمی و ادبی سطح پر یہ زمانہ قابلِ ذکر ہے۔ دادا ازم، سرریلزم، وجودیت اور علامت نگاری کی تحریکوں نے اپنے عہد کی بے چہرگی، اقدار کی پامالی اور فرد کی تنہائی کو تخلیقی سطح پر محسوس کیا۔ اس کے علاوہ ادب اور نفسیات کے تعلق ★ ۲ اور لسانی سطح پر جدید تحریکوں ★ ۳ کے فکری مباحث بھی اپنا اثر دکھانے لگے اور اس طرح ادب میں فکری راہیں کشادہ ہوتی چلیں گئیں۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کا آغاز رومانی رویوں کے فروغ کے ساتھ ہوا۔ رومانوی تحریکوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ: ''اُردو میں یہ روایت مغربی اثرات کی بنا پر شروع ہوئی''۔[۱]

جس زمانے میں یہ ہندوستان پہنچی اُس وقت تک اُس کا رجحان فرسودہ ہو چکا تھا اور یہاں تک آتے آتے اُس کی صورت خاصی مسخ ہو چکی تھی۔ برصغیر میں رومانویت نگاروں سے پہلے ادب میں عورت کا تصور نہایت محدود تھا۔ وہ یا تو طوائف تھی یا انجمن آرا جس کا بیان شاعر اور ادیب چٹخارے لے کر کرتے تھے یا پھر دبیز پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی جس کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ تحریک صرف سرسید تحریک کا ردِعمل نہیں تھی بلکہ معاشرے کی روایات اور رویوں سے بغاوت بھی تھی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں نے ادب میں ایک صحت مند، توانا اور متحرک عورت کو داخل کیا۔ یہی وہ دور ہے جب آسکر وائلڈ کی جمال پرستی، ٹیگور کی ماورائیت اور شاعرانہ نثر نے اُردو افسانے میں جگہ پائی اور اُس دور کے لکھنے والے حقیقت کی بجائے تصوراتی دنیا میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ اثر سجاد حیدر یلدرم (۱۹۴۳ء-۱۸۸۰ء) اور نیاز فتح پوری (۱۹۶۶ء-۱۸۸۴ء) نے قبول کیا۔ نیاز کی انگریزی ادب سے واقفیت اور یلدرم کا ترکی ادب سے متاثر ہونا اُنہیں رومانویت کے قریب لے آیا۔ ابتداء میں پریم چند بھی اِسی رومانویت کے زیرِ اثر نظر آتے ہیں مگر اُن کی رومانیت نے اُنہیں انسان دوستی سے آشنا کیا اور یہی انسان دوستی اُنہیں رومانویت سے حقیقت نگاری کی طرف لے جاتی ہے۔ خاص طور پر اُن کے پہلے افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' کے افسانے حقیقت اور رومان کا امتزاج ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ۲۰ ویں صدی میں ہمیں دو مختلف صورتیں ایک نقطے پر منتج نظر آتی ہیں۔ پہلی صورت سائنسی انکشافات اور اُن کے اثرات اور دوسری صنعتی انقلاب جس نے یورپ کے باہر بھی شعور کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی جس کے تحت فرائیڈ اور مارکس کے نظریات علم و دانش کو متاثر کرنے لگے اور اُردو افسانہ بھی ان اثرات سے بچ نہ سکا۔ گو اُردو افسانہ تخلیق کے ساتھ ساتھ سماجی رجحانات ساتھ لے کر آیا مگر گھٹن کی فضا بدلنے لگی اور دبی دبی جبریت سے سرکشی نے سر اُٹھایا اور زندگی کی تمام جولانیوں اور فکری اُمنگوں کے جلو میں افسانوی مجموعہ ''انگارے'' (دسمبر ۱۹۳۲ء) شائع ہوا۔ ''انگارے'' کے تمام افسانے سماجی قدروں سے یکسر بغاوت

اورانحراف کے حامل تھے۔''انگارے'' پڑھے لکھے نوجوان (سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر) کی تخلیقات پر مبنی مجموعہ تھا جن کا لہجہ نہایت تلخ اور کاٹ دار تھا ''انگارے کی بیشتر کہانیوں میں ٹھہراؤ کم اور رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا[۲]۔''انگارے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک ردِعمل شروع ہو گیا★ ۴۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں اِسے ضبط کرلیا گیا[۳]۔اُردو ادب میں یہ ایک طاقتور رویہ تھا جس نے پہلے سے موجود تخلیقی نظریات میں ہلچل مچادی۔''انگارے اُردو ادب کی تاریخ کو فنی طور پر آگے نہیں بڑھاتا اور نہ ہی مواد، اسلوب اور پیشکش کے اعتبار سے کوئی اجتہاد تھا مگر اُس کے فکری منطقے اُردو افسانے کی تاریخ کا رخ موڑتے ہیں۔''[۴]

انگارے کے افسانے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اُردو افسانے کی روایت سے کھلی بغاوت تھے لیکن اُس کے باوجود ''انگارے'' کے تاریخی کردار کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ترقی پسند افسانے نے انگارے ہی کی خاک سے جنم لیا اور انگارے کے بعد اگلا قدم ترقی پسند تحریک کے روپ میں اُٹھایا گیا۔

> ''ترقی پسند تحریک ایک خالصتاً مادی تحریک تھی جس کا مقصد رومانی بالیدگی کا حصول نہیں بلکہ معاشی انصاف کے لئے زمین ہموار کرنا تھا۔اس مقصد کے لئے ترقی پسند تحریک ان تمام فرسودہ اور رجعت پسند عناصر کے استحصال پر بضد تھی جو ترقی پسند معاشرے کی تشکیل میں مزاحم ہوتے ہیں اور استحصال کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے اپنا سارا زورصرف کر دیتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد سماجی انجماد کو توڑ کر فرد کو صدیوں پرانے ظالم استحصالی نظام سے نجات دلانا تھا۔''[۵]

ترقی پسند تحریک سے پہلے حقیقت نگاری کی تحریک سے وابستہ لوگوں نے خارج کے مشاہدے کو حقیقت کی جزئیات سے پیش کرنے کی کوشش کی۔''حقیقت نگاری کے زیرِ اثر لکھنے والوں نے اپنے وقت کے سیاسی سماجی رجحانات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ عام انسانی زندگی کی نفسیات اور ہندوستان کے مختلف طبقوں کے افراد کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔اگرچہ اُن کے ہاں نئی حقیقتوں کا انکشاف نہیں مگر نفسیاتِ زندگی کی نقاب کشائی کم اہمیت نہیں رکھتی۔''[۶]

حقیقت نگاری کے حوالے سے سب سے نمایاں نام پریم چند (۱۹۳۶ء-۱۸۸۰ء) کا تھا۔ پریم چند کے ساتھ جو نام نمایاں نظر آتے ہیں اُن میں سدرشن (۱۹۲۷ء-۱۸۹۶ء)، علی عباس حسینی (۱۹۶۹ء-۱۸۹۷ء)، اعظم

کریوی (۱۹۵۴ء-۱۸۹۸ء) ہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب سیاسی بیداری عام ہوئی، مادی وسائل کے حصول اور جسمانی ضرورتوں کی تسکین نے فوقیت حاصل کر لی تو ادب میں ایک ایسی تحریک نے جنم لیا جس کے نظریات پریم چند کی حقیقت نگاری سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ ترقی پسند ادب کی تحریک تھی جس کا ابتدائی اجلاس لکھنؤ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔اس کی صدارت پریم چند نے کی۔اس اجلاس کی سب سے اہم چیز پریم چند کا خطبہ تھا۔ ★ ۵

ترقی پسند تحریک ایک انقلابی تحریک تھی جس نے اُس دور کے ذہنوں اور رویوں کو بدلنے کی کوشش کی لہٰذا اُردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا جن میں پریم چند، جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار اور علی عباس حسینی کے نام نمایاں ہیں۔انجمن ترقی پسند کے قیام کے متعلق سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو اُن رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دِلانا ہے جو اپنے ساتھ فن اور آرٹ کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اُس کو زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''[۷]

ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر کا نام اساسی حیثیت رکھتا ہے۔انہوں نے اس تحریک کو سیاسی خطوط پر چلانے کی کوشش کی۔یورپ میں قیام کے دوران ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی آئی اور اُنہوں نے سویت یونین کی طرز کا نظام ہندوستان میں رائج کرنے کا خواب دیکھا۔چنانچہ ایک ادبی منشور تیار کیا گیا۔اس طرح یہ اُردو کی پہلی تحریک تھی جس کے لئے باقاعدہ منشور تحریر ہوا۔بقول ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش یہ ایک طوفانی تحریک تھی جس کی طغیانی میں اُس دور کے بیشتر ادب ڈوبتے چلے گئے اور اُنہوں نے غلام ہندوستان کے لئے ایک خوشحال ملک کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔اس تحریک کے ابتدائی لکھنے والوں میں پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اُنہیں ترقی پسند افسانہ کا پیش رو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔''[۸]

اِس کے علاوہ سجاد ظہیر (۱۹۷۳ء-۱۹۰۵ء)، احمد علی (۱۹۹۳ء-۱۹۱۰ء)، رشید جہاں (۱۹۵۲ء-۱۹۰۵ء) اور محمود الظفر (۱۹۵۶ء-۱۹۰۳ء) شامل تھے جن کے انگارے میں شامل افسانے اگرچہ فنی لحاظ سے کمزور ہیں مگر ترقی پسند نقطہ نظر کے افسانے شمار کئے جاتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد بھی ہمیں افسانہ نگاروں کی ایک ایسی بڑی تعداد دکھائی دیتی ہے جو ترقی پسند سوچ کے حامل تھے اور اُنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو بلند آہنگی

سے ہم کنار کیا (ان کے اسلوب کا جائزہ اگلے ابواب میں لیا جائے گا)۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں کو اس طرح موضوع بنایا کہ وہ جاندار انداز میں افسانے کو نئی سمتیں دینے میں کامیاب ہوگئیں۔ ترقی پسند تحریک ادب میں ایسی تبدیلی تھی جس نے تمام پرانے نقطہ ہائے نظر کو تبدیل کر دیا اور افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ شعور کی رو اور نفسیاتی تجزیہ نگاری کے علاوہ نئے موضوعات افسانے میں جگہ پا گئے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر اُردو افسانے کو نئے اسالیب سے روشناس کرایا۔ یہ اسالیب کسی بیرونی دباؤ کا نتیجہ نہ تھے بلکہ اُس دور کے سیاسی حالت (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) سے اُبھرے تھے۔

اس تحریک میں مستقبل کی طرف بڑھنے کا رجحان موجود تھا، مگر اس تحریک نے جذباتی تحریک اور تخلیق کاری میں فاصلہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ ہمیں اس کے متوازی ایک اور تحریک بھی چلتی نظر آتی ہے جو حلقہ ارباب ذوق (۱۹۳۹ء) کی تحریک تھی۔ اس تحریک کو ترقی پسند تحریک کی ضد قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ داخلیت اور خارجیت، مادیت اور رومانیت، مستقیم ابلاغ اور غیر مستقیم ابلاغ کی بنا پر ان دونوں میں اختلاف ہے۔ حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ہونے والے ادیبوں نے ادب کو ادب ہی کے حوالے سے پہچانا اور ہیئت اور اُسلوب کو اہمیت دی چنانچہ ہر وہ ادیب جو کسی بھی طور ہیئت اور اُسلوب کو اہمیت دیتا ہے ترقی پسندوں کے نزدیک رجعت پسند، زوال آمادہ اور پست رجحانات کا علمبردار ہے۔ لہٰذا ان نظریات کی بنا پر حلقہ ارباب ذوق کو ترقی پسند تحریک کا ردِعمل تصور کیا گیا۔ ''تاہم یہ دونوں تحریکیں ایک ہی زمانے اور ایک ہی جیسے سیاسی وسماجی حالات میں پیدا ہوئیں اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں رومانویت کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔''[۹]

حقیقت نگاری کے میلان کی بنا پر حقیقت نگاری نے افقی جہت اختیار کی اور اجتماعی عمل کو مادی سطح پر بروئے کار لانے کے لئے پیش قدمی شروع کر دی۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کا نصب العین واضح اور منزل متعین تھی جبکہ اس کے برعکس حلقہ ارباب ذوق اجتماع میں گم ہو جانے کی بجائے آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے داخل کی آواز کو سنا اور خارج کے مشاہدے کو تخلیقی عمل کی آنچ سے گزارا اور اُسے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ''حلقہ ارباب ذوق کے نزدیک ہر لکھنے والے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ذات کے حوالے سے کائنات کا مطالعہ جس طرح چاہے، جس رُخ سے چاہے کرے اور ایسی اقدار کو اس انداز سے سامنے لائے جس سے عالمگیر انسانیت سے ہمدردی اور روح کی بالیدگی کی صورت پیدا ہو[۱۰]۔'' گویا حلقہ ارباب ذوق ادب میں کسی نظریات پابندی کا قائل نہ تھا لکھنے والا جس نظریے سے چاہے سوچے، دیکھے اور لکھے۔

فن اور اسلوب کے حوالے سے اگر ہم دیکھیں تو ترقی پسند تحریک توانا اور پر اثر تحریک تھی لیکن اس کے باوجود ایک روکھا پھیکا اور سپاٹ انداز اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ نظریاتی پابندی اور معاشرت کو بنیاد بنا کر ادب تخلیق تو کیا گیا مگر اُس کا سارا حسن نچوڑ لیا گیا۔ جبکہ حلقہ ارباب ذوق اُس وقت ادب برائے دب کا قائل تھا۔ فن برائے زندگی اُن کے نزدیک بے کار اور فالتو شے تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے افسانہ نگاروں نے فرد کی داخلی کیفیات اور نفسیات کے علم سے زیادہ استفادہ کیا اور انسان کے داخل، اُس کی فطرت اور انوکھی جبلت کے زاویے آشکار کرنے کی کوشش کی اور ادب (شاعری، افسانہ) میں علامتی اور استعاراتی اسلوب کو فروغ دیا۔ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو پچھلی روایات سے منسلک رکھا بلکہ گزشتہ روایات اور ادب کے اثاثے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے لئے نئی علامتیں، نئے تلازمات اور نئے موضوعات تلاش کئے۔ بقول یونس جاوید "اُنہیں رومانوی حقیقت پسند کہا جائے تو غلط نہ ہوگا[۱۱]۔" اس تحریک کے اولین افسانہ نگاروں میں شیر محمد اختر، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی کا شمار ہوتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم تک ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے رجحانات ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے افسانے میں شہری زندگی کے ساتھ ساتھ دیہاتی زندگی اور جاگیردارانہ جبر کو بھی پیش کیا۔ جبکہ حلقہ ارباب ذوق نے سماجی مسائل کے پہلو بہ پہلو انسان کی باطنی دنیا کو نمایاں کیا۔ جنسی نفسیات اُس دور کا نیا اور اچھوتا موضوع تھا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا۔ بڑی سطح پر انسانی خون کی ارزانی اور انسانی وقار کی بے حرمتی نے تقسیم اور آزادی کی خوشی کو سوگ میں بدل دیا۔ اس کے علاوہ ہجرت اور اپنی زمین سے دوری کہیں خارجی اور کہیں باطنی سطح پر ماضی پرستی یا Nostilgia بن کر افسانے میں نمایاں ہوا۔ تخلیقی سطح پر اس دور میں بڑا افسانہ لکھا گیا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں منٹو (۱۹۵۵ء-۱۹۱۲ء)، احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء)، مرزا ادیب (۹۹-۱۹۱۴ء)، غلام عباس (۸۲-۱۹۰۹ء)، ممتاز مفتی (۱۹۹۶ء -۱۹۰۵ء)، قدرت اللہ شہاب (۱۹۸۶ء-۱۹۱۷ء)، آغا بابر (۱۹۱۴ء)، ممتاز شیریں (۱۹۷۳ء-۱۹۲۴ء)، حجاب امتیاز علی (۹۹-۱۹۰۳ء)، حاجرہ مسرور (۱۹۲۹ء)، خدیجہ مستور (۱۹۸۲ء-۱۹۲۷ء)، الطاف فاطمہ (۱۹۲۷ء)، غلام الثقلین نقوی (۱۹۲۳ء) اور مسعود مفتی وغیرہ بھی اُردو افسانے کے منظر نامے پر نمایاں ہوتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں افسانے میں علامتی اور تجریدی رجحانات کا فروغ ہوا کیونکہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کا خوف اور جبر معاشرے کی مختلف سطحوں میں سرایت کر گیا اور اُردو افسانے میں جہاں تجرید اور علامتی رجحانات کا فروغ ہوا اُس کے ساتھ داخلیت اور نئی مابعد الطبیعاتی فکر نے بھی افسانے کو متاثر کیا۔ اِسی دوران پاکستان کو دو جنگوں ۱۹۶۵ء،

۱۹۷۱ء کا سامنا بھی کرنا پڑا جس نے مایوسی کی فضا کو اور گہرا کر دیا چنانچہ تجریدی اور علامتی رجحان افسانے میں مقبول ہو گیا اور علامتی افسانہ نگاروں نے اپنی الگ پہچان بنا لی جس میں منشا یاد (۱۹۳۸ء)، اعجاز راہی (۱۹۴۲ء)، سمیع آہوجہ (۱۹۳۶ء)، رشید امجد (۱۹۴۰ء)، منصور قیصر (۱۹۳۲ء)، یونس جاوید (۱۹۴۴ء)، مسعود اشعر (۱۹۳۰ء)، اسد محمد خاں (۱۹۳۶ء)، مظہر الاسلام (۱۹۴۹ء) شامل تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے افسانے کو موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے متنوع کیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد قدرے ایک کھلی فضا کا احساس ہوا مگر ۱۹۷۷ء میں ملک ایک بار پھر مارشل لا کی زد میں آ گیا اور ادب کی دوسری اصناف کی طرح افسانے پر بھی اس کے اثرات پڑے اور علامت نگاری کی وہ تحریک جو ۱۹۶۰ء مین شروع ہوئی تھی مزید فروغ پا گئی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ساختیات اور پسِ ساختیات کی بحثیں ادب کا حصہ بنتی ہیں اور افسانے کو نئی تبدیلی سے دوچار کر گئیں (جن کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا)۔ اب تک اُردو افسانے کی ہیئت اور اسلوب میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں خاص طور پر ۲۰ ویں صدی میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن میں سے مغربی تحریکوں کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مغرب کے مقابلے میں بہت تاخیر سے یہ تحریکیں برصغیر میں داخل ہوئیں مگر بیسویں صدی کی ابتدا سے آج تک ان کے اثرات ہمارے ادب پر موجود ہیں۔ جہاں تک بات افسانے کی ہے تو افسانہ ہے ہی مغربی صنفِ ادب، لہٰذا اس کا مغربی تحریکوں سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ ہم جب اُردو افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں اور ان تحریکات کے آئینے میں افسانے کے خدوخال تلاش کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری کم و بیش اُنہی خطوط پر چل رہی ہے اور ہر دور کے لکھنے والوں نے ان خطوط اور خدوخال کو مزید سنوارا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن ڈاکٹر، ''اردو ادب میں رومانوی تحریک''، (مضمون) لاہور، ادبِ لطیف، سالنامہ،۱۹۵۴ء۔

۲۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، لاہور، مکتبہ اردو، نومبر،۱۹۵۶ء، ص۲۰۔

۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ''جدید اردو افسانے کے رجحانات''، ص۱۶۸۔

۴۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ-۵۷ تک'' (مضمون) مشمولہ ''پاکستانی ادب انتخابِ نثر'' (مرتبہ) رشید امجد، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان،۱۹۹۰ء، ص۱۳۰۔

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''۲۰ ویں صدی کی ادبی تحریکیں''، پاکستانی ادب، تنقید پانچویں جلد،۱۹۸۲ء، جنوری، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی، ص۳۶۱-۳۶۰۔

۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''افسانہ اور افسانے کی تنقید''، لاہور، ادارۂ ادب وتنقید،۱۹۸۶ء، ص۱۵۳۔

۷۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، ص۲۳۔

۸۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ''جدید اردو افسانے کے رجحانات''، ص۱۷۷۔

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص۵۳۶۔

۱۰۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، ''حلقۂ اربابِ ذوق''، لاہور، مجلس ترقی ادب،۱۹۸۴ء، ص۳۶۔

۱۱۔ ایضاً ص۴۳۔

حواشی

★ ١۔ برصغیر کی سیاسی سماجی صورتِ حال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔

i۔ حامد حسن قادری، ''داستانِ تاریخ اردو ادب''، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ١٩٦٦ء۔

ii۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''اردو افسانہ۔تحقیق وتنقید''، ملتان، بیکن بکس۔

iii۔ آلِ احمد سرور، ''نئے اور پرانے چراغ''، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ۔

iv۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ١٩٨٠ء۔

v۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ''جدید اردو افسانے کے رجحانات''، انجمن ترقی اردو پاکستان۔

★ ٢۔ طلوعِ تہذیب سے پہلے بھی انسان اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ بیدارِ شعور سے ہٹ کر بھی ذہنی کارکردگی ہوتی ہے۔ محققین اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ شعور اور لاشعور کی اصطلاحات فرائیڈ (١٩٣٩ء-١٨٥٦ء) سے پہلے وجود میں آ چکی تھیں، لیکن اس کے باوجود جب فرائیڈ نے اپنا نظریہ تحلیل نفسی پیش کیا اور شعور سے زیادہ تحت الشعور کو طاقتور قرار دیا اور لاشعور کو دریافت کیا تو ادبی دنیا میں فلسفیانہ اور نفسیاتی مباحث کا آغاز ہو گیا۔ فرائیڈ کے مطابق یوں تو سماجی، مذہبی پابندیاں ہماری جبلتوں کو آزادانہ اظہار کرنے سے روکتی رہتی ہیں، لیکن تحریر، گفتگو، جانے انجانے میں زبان اور قلم کی لغزشوں میں، خواب میں جب ہمارا شعور ہمارے تحت الشعور پر اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے تو ہماری جبلتیں بھلے رمز و کفایہ کے پردے میں ہی سہی اپنا اظہار کر دیتی ہیں۔ فرائیڈ کے ان نظریات سے کچھ لوگ تو مکمل طور پر متفق ہوئے مگر کچھ نے فرائیڈ کے نظریات کو قبول کرتے ہوئے اپنا انفرادی فلسفہ پیش کیا۔ جس میں ژونگ اور ایڈلر نمایاں تھے۔ ژونگ نے شخصی لاشعور کے ساتھ اجتماعی لاشعور کا تصور بھی پیش کیا۔ جس کے مطابق اجتماعی لاشعور میں ہمارے تمام تر تہذیبی اور تاریخی تجربات کا جوہر محفوظ ہوتا ہے اور کوئی بھی تخلیق صرف فرد کی انفرادی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ ماورائے فرد رجحانات کی حامل بھی ہوتی ہے۔ اِس طرح وہ ادب کو اپنے دَور کے مزاج اور تحت الشعور کا آئینہ قرار دیتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے دیکھیں:

i۔ شہزاد احمد، ''فرائیڈ کی نفسیات - دو دَور''، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ١٩٩٤ء۔

ii۔ محمد اجمل، ''تحلیل نفسیات''، لاہور، نگارشات، ۱۹۶۹ء۔
iii۔ سگمنڈ فرائیڈ، ''تحلیلِ نفسی کا اجمالی خاکہ'' (مترجم) ظفر احمد صدیقی، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء۔
iv۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نفسیاتی تنقید''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء۔
v. The Anatomy of Human Destructiveness, By: Erich Fromm, FawceH Publications, Greenwich connecticut, U.S.A. 1975.
vi. Art and The Create Unconcious, By: Erich Neuraana, Princeton University Press Princeton, 1969.

★ ۳۔ جدید لسانی تحریکوں میں ساختیات (Structuralism) پسِ ساختیات (Post Structuralism) اور ردِ تشکیل (Deconstruction) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ساختیات کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوتا ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ شعبۂ علم نہیں بلکہ بنیادی طور پر ایک طرزِ مطالعہ ہے جس کا دائرہ لسانیات، بشریات، تاریخ اور فلسفے تک پھیلا ہوا ہے۔ ساختیات کے بنیادی اُصول سوئیسر (Ferdinandda Saussur) کے لسانی افکار پر مبنی ہیں جو لیکچرز کی صورت میں موجود تھے جنہیں اُس کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں پیرس سے The course in General Linguistic کے نام سے شائع کیا گیا۔ سوسیئر نے زبان کا مطالعہ نشانات کے (Signs) کے طور پر کیا۔ نشان جو کسی بھی زبان کی بنیادی اکائی یعنی بولا گیا لفظ ہے۔ نشان کو سوسیئر دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا معنی نما (Signifier) اور دوسرا (Signified) معنی نما کوئی بھی بامعنی لفظ اور تصور معنی اُس شے کا تصور ہے۔ سوسیئر زبان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک ''لانگ'' (Langue) اور دوسرا ''پارول'' (Parol)۔ سوسیئر کے لسانی ماڈل کو A.J.Cuddon اس طرح بیان کرتا ہے:

> "Saussure made a number of important original contributions,
> (a) The concept of language as a sign system or structure whose individual components can be understood only in the system as a whole rather than to an external, "reality,
> (b) a distinction between language and parol, langue representing a language as a whole and

parol representing utterance, a particular use of individual units of language,
(c) a distinction between diachronic and synchronic, diachronic denoting the historical study of the growth and development of a language (namely through philology) and synchronic denoting the study of a language as a system at any given moment of its life (Saussure put most emphasis on synchronic study),
(d) a distinction between the signifier and the signified."

(Dictionary of Literary terms and Literary Theory, A.J.Cuddon, Penguin Books, England, 1994, P.223-224)

سوسیئر کے لسانی افکار ساختیاتی فکر کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور بعد میں آنے والی تبدیلیوں میں بھی اُن کا کردار کلیدی ہے۔ پسِ ساختیاتی مفکرین رولاں بارتھ، لاکان اور فوکو وغیرہ کے ہاں ساختیاتی مباحث کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ پسِ ساختیات کے مباحث میں ردِ تشکیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جدید ترین لسانی فلسفے میں ردِ تشکیل معنی آفرینی کا جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ ردِ تشکیل کا پہلا وار ساختیاتی فکر پر ہوا۔ ساختیات کسی لسانی نظام کے مربوط علم کا نام ہے، جبکہ ردِ تشکیل سِرے سے کسی نظام کے وجود ہی سے انکار ہے۔ ردِ تشکیل نے پہلا سوال سوسیئر کے نشانات کے نظام پر اُٹھایا۔ ردِ تشکیل مفکر ژاک دریدا (Jacques Derrida) کے بقول زبان محض افتراق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہر Sign اپنی معنیاتی شناخت کے لیے کسی دوسرے Sign کا سہارا لیتا ہے۔ دریدا کے خیال میں معنی خیزی کا عمل اس عملِ افتراق کے باعث ہوتا ہے اور معنی در معنی کا سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے اور ردِ تشکیل کی ردِ تشکیل (Deconstruction of Deconstruction) سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ ردِ تشکیل ایک باغیانہ اور بے حد پیچیدہ طریقۂ مطالعہ ہے جو کہ اپنی مخصوص اصطلاحات کے ساتھ متن کا جائزہ لیتا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں:

i۔ ضمیر علی بدایونی، ''جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت''، کراچی، اختر مطبوعات، ۱۹۹۹ء۔

ii۔ گوپی چند نارنگ، ''ساختیات پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

iii۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''معنی اور تناظر''، سرگودھا، مکتبۂ نردبان، ۱۹۹۸ء۔

iv. Modern Criticism and Theory, By: David Lodge, London, 1988.

v. Deconstruction, Theory and Practice, By: Christopher Norris, Routledge, London and New York, 2000.

vi. Criticism in Society, By: Imre Salusinszky, Methuen, New York, London, 1987.

vii. Literary Theory, The Basics, By: Hans Bertens, London, 2000.

viii. Deconstruction and Criticism, Routledge and Kegan Paul, London, 1979.

ix. Modern Literary Theory (Ed.) Philip Rice and Patricia Waugh, Arnold, London, 2001.

★ ۴۔ ''انگارے'' کی اشاعت پر ہونے والے ردِ عمل کی تفصیل کے لیے دیکھیں:

i۔ احمد علی، ''ترقی پسند تحریک کا پسِ منظر'' (مضمون)، کراچی، افکار، مارچ ۱۹۷۴ء۔

ii۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، حیدرآباد، ادارۂ اشاعت اردو، ۱۹۴۵ء۔

iii۔ احتشام حسین سیّد، ''تنقید اور عملی تنقید''، لکھنؤ، کتاب پبلی شرز، ۱۹۶۱ء۔

★ ۵۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۵۶ء۔

☆☆☆